اشارات

جماعت اسلامی سے گذشتہ پچاس سال میں اللہ تعالیٰ کے دین کی جو کچھ بھی خدمت بن پڑی ہے ــــ اور یہ خدمت یقیناً اس حقِ جہاد کے مقابلے میں بہت کم ہے جو اللہ کی طرف سے ہم پر عاید ہوتا ہے ــــ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی تائید ہی سے ممکن ہوئی ہے۔ مستقبل میں بھی ہم جو کچھ کر سکیں گے، وہ بھی صرف تائیدِ الٰہی ہی سے ممکن ہوگا۔ اس لیے ہم کو سب سے بڑھ کر اس بات کی فکر ہونا چاہیے، اور سب سے بڑھ کر اہتمام اور کوشش اس بات کے لیے کرنا چاہیے، کہ ہم کو ہر وقت اور ہر قدم اللہ تعالیٰ کی بھرپور تائید حاصل رہے، اور ہم کبھی کوئی کام ایسا نہ کریں کہ اس کی تائید سے محروم ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کی تائید دو بڑے ذرائع سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک نصرتِ الٰہی کے ذریعے دوسرے ایک ایسی جماعت کے ذریعے جو ایمان کی بنیاد پر منظم ہو، ایمان کی راہ پر سرگرمِ عمل ہو، اور جس کا ایمان اس شان کا ہو کہ وہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی بشارت کی مستحق ہو سکے۔

اسی لیے ہمارے لیے، ہر چیز سے بڑھ کر، یہ ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر فرد، اپنی بساط بھر، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق صحیح اور زیادہ سے زیادہ مضبوط اور گہرا کرنے میں لگا رہے ــ "لگا رہے" کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ یہ مقصد مسلسل توجہ اور کوشش چاہتا ہے۔ جس لمحہ بھی ہم اس سے غافل ہوں گے، ہم اس تعلق کو کمزور اور ضائع کرنا شروع کر دیں گے۔ اور "بساط بھر" میں نے اس لیے کہا کہ کیفیات تو کسی کے بس میں نہیں، لیکن یہ ہمارے بس میں ہے کہ ہر کام کرتے ہوئے صرف اللہ تعالیٰ

کی رضا کے حصول کی شعوری نیت کریں۔ شیطان کہیں وسوسہ ڈال دے اور نیت میں آمیزش کر دے، تو وہ قابلِ معافی ہے، مگر جوں ہی اس کا احساس ہو فوراً اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دے دیا جائے۔ یہ بھی ہمارے بس میں ہے کہ جو کام اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے ہیں ان سے اجتناب کریں۔ شیطان کہیں لغزش اور گناہ میں مبتلا کر دے، تو استغفار اور توبہ کے ذریعہ اس کے عواقب سے بچنے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یہ بھی ہمارے بس میں ہے کہ ہم فرائض ادا کریں، اور اس کی خوشنودی کے دوسرے کام بھی جو فرض نہیں اپنی مرضی سے، رضاکارانہ طور پر، ڈھونڈ ڈھونڈ کر کریں۔ یہ بھی ہمارے بس میں ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد کو دُنیا کی دوسری محبتوں پر ترجیح دیں۔ اور یہ بھی ہمارے بس میں ہے کہ جب ہم سے کوئی غلطی یا گناہ ہو جائے تو ہم اس پر نادم ہوں، اس کا اعتراف کریں، اس پر ربِ غفور رحیم سے مغفرت طلب کریں، اس کی تلافی کریں اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کریں۔ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا، غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔

یہ للّٰہیت راہِ حق کے سفر میں بالکل ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر نہ قدم بڑھانا ممکن ہے، نہ منزلیں طے کرنا۔ کوئی بلند بانگ دعوے اور کوئی بھاگ دوڑ اس للّٰہیت کا بدل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس للّٰہیت کے ساتھ ساتھ اجتماعیت کی مضبوطی اور قوت بھی ناگزیر ہے۔

اقامتِ دین کے کام کے لیے منظم جماعتی زندگی کا ناگزیر ہونا ہماری دعوت کا بنیادی جزو ہے۔ جماعتی زندگی کی طرف ہماری دعوت اور جماعتی زندگی کے ہمارے اہتمام کو اس بات میں بڑا دخل ہے کہ جو سفر ۷۵ افراد کی قلیل تعداد سے شروع ہوا تھا، اس میں آج اَن گنت ساتھی شریکِ سفر ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے بارے میں عام طور پر سمجھا جاتا اور کہا بھی جاتا ہے کہ یہ ملک کی سب سے زیادہ منظم جماعت ہے۔ ایمان کی بنیاد پر قائم ہونے والی اس جماعت کی حفاظت و بقاء، اور توسیع و ترقی کے ذریعے ہی ہم کو تائیدِ الٰہی بھی حاصل ہو سکتی ہے، اور ہم کامیابی سے بھی ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں آئندہ آنے والے مراحل میں ان چیزوں کی خصوصی فکر کرنا چاہیے جن کے اندر جماعت کی

زندگی، حرکت، استحکام اور قوت کا سامان مضمر ہے۔

جماعت کے لیے بھی، فرد کی طرح، سب سے پہلے، اس کی زندگی، استحکام اور قوت کا راز اپنے مقصد کے شعور، اس کے لیے یکسوئی اور اس کے ساتھ وابستگی میں پوشیدہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کا مقصود و آرزو ہونا، اس کے لیے جستجو، اور اُس ہی کے لیے جستجو، اور اقامتِ دین کے لیے جہاد کی راہ سے جستجو۔ یہ مقصد ہر وقت ہر کام میں ہر سطح پر، ہمارے سامنے رہے۔ اسی میں افراد کے لیے جذبات اور قوتِ متحرکہ کی بیداری اور صحیح راہ پر قائم رہنے کا سامان ہے۔ اور اسی میں جماعت کے لیے زندگی، استحکام اور پیش رفت کی ضمانت ہے۔

ہم کام جو بھی کریں، لگتا ہوں کو اسی مقصود پر جما رہنا چاہیے، اور اِدھر اُدھر نہ بھٹکنا چاہیے۔ انفرادی ملاقات ہو یا تبلیغی کیمپ، اجتماعِ کارکناں ہو یا جلسۂ عام، جلوس ہو یا مظاہرہ، انتخابات ہوں یا پاسبان ریلی —— سب کاموں میں یہی مقصد واضح طور پر، شعور کے ساتھ، دل میں تو لازماً ہونا ہی چاہیے جہاں ممکن ہو وہاں زبان پر بھی۔

ہوسکتا ہے کہ کبھی یہ مقصودِ اصلی مدہم ہو جائے، دھندلا جائے، یا خدانخواستہ نگاہوں سے محو ہو جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے ساتھ دوسرے مقاصد کی آمیزش ہو جائے۔ ہر صورت میں اپنی حفاظت ضروری ہے۔ اور اس خطرہ کا علاج خود احتسابی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جو جماعت یکسو ہو، اپنی یکسوئی کو برابر جانچتی اور پرکھتی رہے، اور یکسو رہے، وہ جماعت اپنی قوت و طاقت کے اصل خزانے اور سرچشمہ سے کبھی نہ کٹے گی، کبھی محروم نہ ہوگی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (بے شک جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب تو صرف اللہ ہی ہے، اور پھر اس پر جم گئے۔ یہی ہماری ساری قوت و طمانیت کا خزانہ ہے۔

مقصد کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر اجتماعی کام سے فرد کے جنت میں جانے کا راستہ کھلنا چاہیے، اس کو جنت کے کچھ اور قریب پہنچنا چاہیے اسی طرح وہ آخرت میں وَ اُزْلِفَتِ

الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (اور جنت متقین کے قریب لے آئی جائے گی، کچھ بھی دور نہ ہوگی) کی بشارت کا حق دار ٹھیرے گا۔ دوسری دنیا میں ہر اجتماعی سرگرمی سے جماعت کے قدم، اقامتِ دین اور انقلابِ امامت کی منزل کی طرف کچھ آگے بڑھنا چاہئیں ۔ یہ کسوٹی ہمیشہ ہمارے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ جس اجتماعی کام سے یہ دونوں چیزیں کسی درجہ میں حاصل نہ ہوں، یا قابلِ لحاظ درجہ میں حاصل نہ ہوں، اس کام کو برائے کام کیے چلے جانے کا حاصل شاید ضیاعِ محنت کے سوا کچھ نہ ہو۔ ایسے کام کے بارے میں ہمیں فکر میں پڑ جانا چاہیے ایسے کام میں نئی رُوح پھونکنا چاہیے، یا اس کا سانچہ بدلنا چاہیے، یا اس کو ترک کر کے دوسرے کام اختیار کرنا چاہئیں ۔ بے جان مذہبی مراسم کی تو پھر بھی ایک افادیت ہے۔ لیکن خود اپنے اُوپر عاید کردہ بے نتیجہ اور بے ہدف اجتماعی کاموں کے بے جان جسد کو اُٹھائے لیے پھرنے کی افادیت مشکوک ہے۔ جو عمل خدا اور رسول نے مقرر کر دیئے ہیں، ان میں تو اصل چیز اطاعتِ امر ہے۔ اس کا اجر ہے، اور وہ محفوظ ہے۔ جو عمل خود ہم نے اپنے اُوپر فرض کیے ہیں، ان کو مقصد کی اس کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے۔ ورنہ بے جان جسد اُٹھائے پھرنے سے بالآخر حواس اور اعصاب تھکن کا شکار ہوتے جاتے ہیں — حوصلوں کی کمر خم ہوتی چلی جاتی ہے۔ لذت و ذوق رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ اور اپنے اُوپر اپنے ہی عاید کردہ فرائض اصر و اغلال (بیٹھ کے بوجھ اور جسم کی بیڑیاں)، بنتے چلے جاتے ہیں۔

جو کام خالص دینی سمجھے جاتے ہیں، ان میں سے بھی مقصود و مطلوبِ اصلی کی رُوح نکل سکتی ہے۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ اور حج سے۔ یہ بھی صرف عادت، یا اس سے زیادہ صرف دکھاوے کے مراسم بن سکتے ہیں۔ لیکن جو کام بظاہر دینی نہیں نظر آتے اور سمجھے جاتے — مثلاً ہفتہ وار اجتماعات، رپورٹیں، جلسے، جلوس، سیاسی کام — ان میں سے تو مقصد کے شعور، مقصد کی نیت اور مقصد کی لگن کے ضیاع کا خطرہ بہت زیادہ حقیقی ہے۔ اس لیے عوامی اصلاح و دعوت، خدمتِ خلق اور انقلابِ قیادت کے لیے سرگرمیوں جیسے نازک اور پُرخطر کاموں میں جماعت کو زیادہ چوکس و نگران

رہنے کی ضرورت ہے

اللہ تعالیٰ نے جہاں مومنین کے ذریعے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کا ذکر فرمایا ہے، وہاں ان مومنین کی قوت کا سرچشمہ صبر کو قرار دیا ہے۔ بس اگر دو سو پر بھاری ہیں، تو وہی جو صابر ہیں۔ اور ضعف کے آجانے کے بعد بھی، سو کی تعداد دو سو پر غالب آسکتی ہے، لیکن وہی جو صابر ہیں۔ رَبُّنَا اللّٰہُ کے اقرار کے بعد، گویا اللہ تعالیٰ کو مقصود و مطلوب قرار دینے کے بعد، جو اس مقصد پر استقامت اختیار کریں، ان ہی کے لیے دُنیا اور آخرت کی کامرانیوں کی بشارت ہے۔ استقامت صبر کے بغیر ممکن نہیں۔ بلکہ استقامت صبر ہی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی اور نصرت کے عہد کو ایفا کرنے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کے لیے سب سے بڑھ کر مدد دینے والی جو چیز ہے، وہ بھی صبر ہے۔ دُنیاوی سربلندی ہو، یا جنت کے اعلیٰ درجات و مقامات، دونوں صبر کی صفت رکھنے والوں ہی کا حصہ ہیں۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا ط

(الاعراف - ۷ - ۱۳۷)

(اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہوا۔ کیونکہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا۔

اِنِّىْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ

(المومنون ۲۳-۱۱۱)

(آج ان کے اس صبر کا میں نے یہ پھل دیا ہے کہ وہی کامیاب ہیں۔)

مصائب اور آزمائشوں کے مقابلہ میں صبر کی اہمیت اور ضرورت تو عام طور پر معروف اور واضح ہے۔ لیکن کم لوگ اس بات کا پورا ادراک رکھتے ہیں کہ جماعت میں افراد کو باہم جوڑے رکھنے کے لیے، اور ان کے حلقۂ اتصال میں قوت و استحکام پیدا کرنے کے لیے، اور خود جماعت کے لیے اپنی سرگرمیوں میں صحیح راہ پر قائم رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے صبر کتنا

ناگزیر ہے۔ اس لیے ایمان باللہ، للّٰہیت، اپنے مقصد کے شعور اور اس کے ساتھ وابستگی کے بعد جس دوسری چیز کا اہتمام اور فکر ہمارے لیے ناگزیر ہے، وہ صبر ہے۔

صبر کے معنی ہی باندھنے، روکنے، اور جم جانے کے ہیں۔ اس لیے باہمی تعلقات کے لیے اس سے زیادہ خوب صورت اور موزوں پیرایۂ بیان کیا ہو سکتا تھا جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اختیار کیا ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۔ (الکھف ۱۸:۲۸)

(اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں، اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو)

جماعت میں جو لوگ بھی آپ کے ساتھ ہیں، اسی لیے ساتھ ہیں کہ وہ رضائے الٰہی کے طلب گار ہیں۔ (يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ)۔ اور جماعتی زندگی اختیار کرنے میں ان کی غرض بھی یہی ہے کہ وہ رات دن، صبح و شام، ہر وقت اپنے رب کی بندگی کر سکیں۔ اس لحاظ سے اس دیوار میں چنی جانے والی ہر اینٹ دوسری اینٹ کے لیے انتہائی قیمتی ہے۔ ہر اینٹ کی اپنی قوت کا، اور پوری دیوار کی قوت کا بھی، انحصار اسی پر ہے کہ خواہ وہ کسی کے اُوپر ہو، کسی کے نیچے ہو، کسی کے پہلو بہ پہلو ہو، کسی کا بوجھ اُٹھائے، کسی پر بوجھ ڈالے، ہر حالت میں اس کے ساتھ صبر کے سیمنٹ کے ساتھ جڑی رہے۔ صبر اختیار کرے، صبر کی روش پر گامزن رہے۔ صبر نہ ہو تو کوئی چیز باہمی تعلقات کو بگڑنے سے نہیں بچا سکتی۔

سارے انسان اپنی اپنی سوچ، طبیعت، مزاج، افتادِ طبع، جذبات و محرکات، اور علم و عمل، کے لحاظ سے باہم مختلف ہوتے ہیں۔ جہاں انسان جمع ہوں گے، وہاں ایسی باتوں سے کوئی مفر نہیں جن سے کبھی اختلاف پیدا ہو، کبھی ناگواری ہو، کبھی تکلیف پہنچے، کبھی غصہ آئے، کبھی ناراضگی ہو، کبھی دل خراب ہو جائیں۔ پھر ان چیزوں کے ردعمل میں، شیطان اپنی وسوسہ کاریوں کے ذریعے، ان راہوں پر لے جائے جن پر جانا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے۔ جن سے دل خراب ہوتے ہیں، تنازعات پیدا ہوتے ہیں، تعلقات میں

بگاڑ آتا ہے، یا وہ سرد مہری کا شکار ہو جاتے ہیں، ان میں سے محبت کی شیرینی، شوق، تازگی اور لذت رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ ہر گام، ہر مقام، ہر لمحہ یہ ہمارا صبر ہی ہے جو آگے بڑھ کر ہمارے دل کو، ہماری زبان کو، ہمارے ہاتھ کو تھام سکتا ہے۔ اور انہیں اس حرام میں مبتلا ہونے سے روک سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حرام سے بڑھ کر حرام کیا ہے۔ یعنی مسلمان بھائی کی عزت، اس کا مال اور اس کی جان۔ صبر ہی تعلقات کے اس بگاڑ سے، بچا سکتا ہے جو استرے کی طرح سارے دین ہی کا صفایا کر دیتا ہے۔

کسی بھائی کی کوئی بات ہمیں ناپسند یا ناگوار ہو جائے، کہیں اختلاف ہو جائے، کہیں ہماری انا کو ٹھیس لگ جائے، کہیں کوئی تکلیف پہنچ جائے، کہیں وہ ہمارے حقوق میں کوتاہی کا مرتکب ہو جائے، تو دل و زبان اکثر، اور کبھی ہاتھ بھی، جن حرام کاموں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان میں سے چند سے ہمیں خاص طور پر ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے دل بدگمانی سے راہ پکڑتا ہے۔ جن باتوں کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا اور جو صرف وہم و قیاس کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں، ان کو دل سوچ بھی لیتا ہے، ان پر یقین بھی کر لیتا ہے، انہیں اندر بٹھا بھی لیتا ہے، اور کہیں سے سن لے تو فوراً ایمان بھی لے آتا ہے۔ اس لیے کہ بدگمانی کی ریت پر ہی تحقیر، حسد، غیبت، تجسس، تمسخر، تنابز بالالقاب، ہمز جیسے حرام اعمال کے قصر تعمیر ہو سکتے ہیں۔ ایک بھائی کی زبان پر دوسرے بھائی کے خلاف جو باتیں ہوتی ہیں، آپ ان کا جائزہ لیں تو اکثر و بیشتر ان کو بدظنی پر مبنی پائیں گے۔ اکثر ان کی بنیاد اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی کہ "اس کے علاوہ اور کیا معنی اور مطلب ہو سکتے ہیں" اس سے بڑھ کر یہ کہ "میں جانتا ہوں" — اور یہ دلیل کافی ہو جاتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس کی نیت کیا ہے"۔ حالانکہ یہ مقام تو صرف علیمٌ بذاتِ الصدور کا مقام ہے۔ ایسا کہنا خدائی کے دعوے سے کم مقام کا دعویٰ نہیں۔

دوسری خرابی دل میں تحقیر و استخفاف کا راہ پالینا ہے۔ وہی اینٹ، خواہ وہ

اُوپر ہو یا نیچے یا پہلو میں، جو (یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ) "اور اس کے رضا کے طلب گار ہیں"۔ کے مقصد میں شرکت کی بنیاد پر بہت قیمتی اور بہت عزیز ہونا چاہیے، اور جس سے محبت نہ بھی ہو تو کم سے کم اس کی وقعت اور عزت و احترام اور قدر و قیمت کا احساس تو لازماً ہونا چاہیے، وہی اینٹ نگاہوں سے گرنا اور دل میں بے وقعت ہونا شروع ہو جاتی ہے، حالانکہ مسلمان کی تباہی و ہلاکت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے — ایک دفعہ بدگمانی کے قصر تعمیر ہونے لگیں، اور تحقیر و استخفاف کی مہمیز لگ جائے، تو زبان کی لگام ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ اور وہ فقرے بازی، تمسخر، چغلی، مجلسوں میں اور نجی گفتگوؤں میں پیٹھ پیچھے غیبت جیسی مہلکات میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بدگمانی دلیل کی قوت فراہم کرتی ہے، اور تحقیر و استخفاف ان سارے اعمال کے لیے جواز مہیا کرتے ہیں۔

انا کو ٹھیس پہنچے، غصہ آئے، تکلیف پہنچے، ناگواری پیدا ہو، ہر حالت میں ہمیں دل و زبان کو صبر کی لگام دینا چاہیے۔ اگر اللہ کی رضا، اس کی مغفرت، اور جنت جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں، یہی مطلوب و مقصود ہوں تو وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ کا مقام ہمیشہ سامنے رہنا چاہیے۔ سیدھا سیدھا راستہ یہ ہے کہ ہم یہ طے کر لیں کہ جس بات کو ہم اسلام کے معیار عدل کے مطابق دو آدمیوں کے سامنے ثابت نہ کر سکیں، جو ہم تک کسی فاسق کے ذریعے پہنچی ہو، یا کسی قابلِ وثوق ذریعہ سے نہ پہنچی ہو، جس کی ہم نے تحقیق نہ کی ہو، جو صرف سنی سنائی ہو، اس کو ہرگز نہ دل میں جگہ دیں گے، نہ زبان پر لائیں گے — ہر مسلمان بھائی کو، اور خصوصاً اس مسلمان بھائی کو جس نے راہِ حق پر چلنے کے لیے ہمارا ہاتھ تھاما ہے اور ہمارا ساتھی بن گیا ہے، قیمتی، وقیع، معزز و محترم، اور عزیز جانیں گے۔ جن کو ہم گفتگوؤں میں، تقریروں میں اور اسٹیج پر واجب صد احترام قرار دیتے ہیں، ان کو دل میں بھی محترم رکھیں گے، اور زبان پر بھی۔

اگر ہم نے یہ اُصول اختیار کر لیا اور اس کی پابندی کی تو ہم اس بیماری سے بھی اپنا دامن بچا لیں گے جو ہمارے معاشرہ میں بلائے عام کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ یعنی بلاتحقیق،

سُنی سُنائی باتوں کو نقل کرتے پھرنا۔ یہ باتیں ہم نجی گفتگوؤں میں کہیں، تقریروں میں کہیں، اخباروں میں چھپوائیں، فوٹو کاپیاں کر کے تقسیم کریں، ایسا کرنا ہر حال میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہوگا کہ "یہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے کافی ہے"۔

انا کو ٹھیس پہنچے، غصہ مغلوب کرے، حسد پیدا ہو جائے، اور بدگمانی اور تحقیر راہ پالیں، تو پھر زبان وہ بیج بوتے لگ جاتی ہے جن کی فصل سر کے بل جہنم میں گرنا ہے۔ یہ زبان ہی ہے، جو سب سے بڑھ کر، اس استرے کا کام کرتی ہے جو سارے دین کو مونڈ ڈالتا ہے اور سارے نیک اعمال کی کمائی اکارت کر دیتا ہے۔ تمسخر ہو، اشاروں کنایوں میں بدگوئی ہو، چغلی ہو، غیبت ہو، تنابز بالالقاب ہو، تجسس اور کشفِ عیوب ہو، غیبت و بہتان ہو، یہ ایسی حرام چیزیں ہیں جو مُردار، سود، اور زنا کی طرح قبیح ہیں۔ سود، فحاشی اور حرام غذا سے ہمیں جو گھن آتی ہے، ان سے ہم جس شدت سے اجتناب کا اہتمام کرتے ہیں، ان کا ذکر جس انداز اور مقدار میں ہماری زبانوں پر رہتا ہے، کیا زبان کے لیے حرام کردہ ان چیزوں سے بھی ہمیں اسی طرح یا اس سے زیادہ گھن آتی ہے، اور ان سے بھی ہم اسی طرح، یا اس سے زیادہ اجتناب کرتے ہیں؟ یہ سوال ہمیں اپنے آپ سے بار بار کرنا چاہیے۔

اگر ہم چند سیدھے سادے اُصولوں کی پابندی کریں تو ان محرمات سے بچنا کوئی دشوار نہیں۔

۱۔ بولیں گے تو بھلی بات بولیں گے، ورنہ خاموش رہیں گے۔

۲۔ بات کریں گے تو عدل کی بات کریں گے۔ اپنی بات ہو یا پرائیوں کی، اپنوں کی ہو یا دشمنوں کی۔

۳۔ جو بات کریں گے، وہ اچھی، خوبصورت، میٹھی اور نرم بات ہوگی۔

۴۔ کسی کا بھی زبان سے ایسا ذکر نہ کریں گے جس سے اُس کی بُرائی نکلتی ہو، اِلّا یہ کہ ایسے ذکر کے لیے واضح شرعی دلیل موجود ہو۔ اور واضح شرعی دلیل ہو، جب بھی اجتناب ہی کو اولیٰ سمجھیں گے۔

زبان کے استعمال پر یہ پابندیاں بڑے صبر اور عزیمت کا تقاضا کرتی ہیں۔

انسانوں کا مُردار گوشت انسانوں کے لیے بڑی لذت رکھتا ہے۔ زبانیں اس کے چٹخاروں کی عادی ہو جاتی ہیں۔ اس لیے غیبت سے اجتناب کے لیے خصوصی کوشش کی ضرورت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی غیبت کی یہ تعریف کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ بھائی کی بُرائی کا وہ ذکر جو اُسے ناگوار ہو، اگرچہ یہ بُرائی اس میں موجود ہو، ------ یا آپ کی بُری رائے ظن وتخمین پر مبنی ہو، یا بلاثبوت وتحقیق قائم کرلی گئی ہو، تو غیبت کے ساتھ بہتان، جھوٹ، ظلم وغیرہ کئی دوسرے گناہ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ علما نے وہ مواقع متعین کر دیے ہیں جہاں کسی کی واقعی بُرائی کے ذکر کے جواز کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ غور کیا جائے تو ان سب کا خلاصہ دو باتوں میں ہے۔ ایک یہ کہ کسی دوسرے کو اس کی بُرائی کے ضرر سے بچانا ضروری ہو۔ اس صورت میں اُسی حد تک اجازت ہے جس حد تک بچانے کے لیے ضروری ہے، اور اسی کے سامنے اجازت ہے جس کو بچانا ضروری ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی کے پہنچائے ہوئے ظلم یا ایذا کا ازالہ، مداوا یا تلافی مقصود ہو۔ اس صورت میں بھی اُسی کے سامنے ذکر کی اجازت ہے جو اس ازالے یا دادرسی کا اختیار رکھتا ہو، اور اُسی حد تک جس حد تک اس مقصد کے لیے ضروری ہو۔ ہم غور کریں تو یہ ایسی سخت شرائط ہیں کہ مُشکل سے ہی کسی کی زبان کسی دوسرے کی بدگوئی کے لیے کُھل سکتی ہے۔ جہاں کسی فرد یا مجلس کو نہ تو اصلاح و ازالہ کا اختیار ہو، نہ اُس پر اُس کی ذمہ داری آتی ہو، وہاں اس فرد یا مجلس کے سامنے بدگوئی کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ اِسی طرح کسی کے خلاف شکایت، یا اُس کی خرابیاں لکھ کر فوٹو کاپیاں کر کے تقسیم کرنے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ ہر وہ شخص جس کی نگاہوں سے ایسی تحریر گزرتی ہے، نہ تحقیق کی ذمہ داری رکھتا ہے نہ وسائل، نہ وہ اصلاح و ازالہ پر قادر ہے نہ اس کے لیے ذمہ دار۔ یہ تو غیبت کی بدترین شکل ہے۔ اس معیار پر ہمیں اپنی ساری انفرادی اور مجلسی گفتگوؤں کا، اور اپنی تحریروں کا احتساب خود کرنا چاہیے۔ اور ان کو غیبت سے پاک کرنا چاہیے۔ اس سے نہ صرف ہماری انفرادی فلاح وابستہ ہے، بلکہ جماعت کی قوت اور استحکام بھی۔

جس طرح باہمی تعلقات میں صبر ناگزیر ہے، اسی طرح جماعتی زندگی کے تحفظ و استحکام کے لیے بھی صبر ناگزیر ہے۔ جماعتی نظام کے تحفظ و استحکام کے لیے ضروری ہے کہ مشورہ کے وقت ہم اپنی رائے چھپانے کے بجائے کھل کر ظاہر کریں اور کسی کمزوری، مروت، مداہنت یا خوف کا شکار نہ ہوں۔ اپنی رائے پر اس حد تک اصرار نہ کریں کہ افتراق و انتشار کی نوبت آجائے۔ فیصلہ ہو جائے تو اس پر عمل کریں۔ اور اگر دستور عمل نہ کرنے کی رخصت دے تو جماعت کو اس پر عمل کرنے دیں اور اس میں رخنے نہ ڈالیں۔ جماعت کے اکثر و بیشتر فیصلے تدابیر کے زمرہ میں آتے ہیں۔ تدابیر میں اختلاف رائے سے مفر نہیں، اور ہر فیصلہ ہر ایک کے لیے دل پسند نہیں ہو سکتا۔ اپنی پسند یا رائے کے خلاف فیصلے کے خلاف کوئی ایسی بات نہ کہنا اور نہ کرنا جو جائز نہ ہو، صبر کے بغیر ممکن نہیں۔

مخالفین کے مقابلہ میں مضبوط رہنا، مگر اپنی گفتار و کردار کو شریعت کے دائرہ میں رکھنا بلکہ مکارم اخلاق کی بلندیوں کا اہتمام کرنا، ایک طرف کمزوری اور مداہنت اور بزدلی سے دل کو پاک رکھنا اور دوسری طرف متوازن جذباتیت کا شکار نہ ہونا، ایک طرف اپنی رفتار کو تیز سے تیز تر کرنا اور اپنی کارکردگی کو بہتر سے بہتر بنانا اور دوسری طرف عجلت پسندی سے خود کو بچانا — یہ چیزیں بھی جماعتی استحکام و قوت کے لیے ضروری ہیں، اور یہ بھی صبر ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۔ وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۔ (حٰم السجدہ)

اگر ہمارے اندر یہ صبر پیدا ہو جائے تو دشمن کی کوئی قوت اور کوئی تدبیر ہمیں ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا

(آل عمران)

جماعت کی قوتِ مطلوب کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ہمارے تعلقات میں کوئی بگاڑ نہ ہو، ہمارے ہاتھوں اور زبانوں سے ہمارے بھائیوں کی عزت اور اموال محفوظ ہوں، ہم تعلقات و معاملات کے دائرے میں محرمات سے اسی طرح اجتناب کریں، جس طرح شراب، جوئے، سود اور زنا جیسی محسوس محرمات سے اجتناب کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان تعلقات میں محبت کی شیرینی ہو، اور یہ رحمت و مودت کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے ہوں گویا ہم باہم رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ کی تصویر و تفسیر ہوں۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سب سے بڑھ کر محبت ہو۔ اور یہ بھی کہ جن سے اللہ تعالیٰ کے واسطے کا تعلق ہو، اللہ تعالیٰ کے نام پر تعلق ہو، اللہ تعالیٰ کے کام کے لیے تعلق ہو، نصرتِ دین کے لیے تعلق ہو، ان سے بھی محبت کا تعلق ہو، اور گہری محبت کا تعلق ہو۔

رحمت کی صفت تو بہت جامع اور ہمہ گیر ہے۔ اگر ہم نے رحمٰن و رحیم کی بندگی اختیار کی ہے، اور اس کی بندگی کے داعی بھی ہیں، اگر ہم اپنا شمار رحمۃ للعالمین کے متبعین میں کرتے ہیں، اور ان کی سنت اور اُسوہ پر چلنے کے مدعی بھی ہیں تو ہماری گفتگو اور روش کو سنتِ رحمت کا مظہر ہونا چاہیے۔ رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ قلب میں نرمی اور لینت ہو، گفتگو میں نرمی اور حُسن ہو، برتاؤ میں نرمی اور سہولت ہو۔ یہ سب رحمت کے مظہر ہیں۔ وسعتِ ظرف، عفو و درگذر بھی رحمت کا مظہر ہیں۔ خبرگیری، اعانت و تعاون، غم و تکلیف میں شرکت بھی تعاطف و تراحم کا تقاضا ہیں۔

محبت کے تقاضے کیا ہیں، آداب کیا ہیں؟ کسی کے لیے بھی یہ چیزیں بتانی ضروری نہیں۔ اس لیے کہ محبت خود ہی استاد ہے، خود ہی راہنما، اور خود ہی دلیل۔ رحمت و محبت کا تعلق سرسری اور سطحی نہیں ہو سکتا۔ اس میں لازماً گہرائی، رنگ اور خوشبو ہو گی۔ جس سے محبت ہو اس کے حال سے ہم غافل نہیں ہو سکتے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے رفیق سے ہمیں محبت ہو، اور برسہا برس اس کے ساتھ کام کرنے کے باوجود ہمیں یہ پتہ نہ ہو کہ اس کی نجی اور خانگی زندگی میں اس پر کیا گذر رہی ہے؟

اگر ایسا ہے تو ہمارا دعویٰ محبت ابھی خام ہے۔

محبت کے ساتھ وہ تمام خرابیاں جمع نہیں ہو سکتیں جن کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے۔ محبت ہو تو بدظنی کے بجائے حسنِ ظن ہوگا، تحقیر کے بجائے احترام ہوگا، بدگوئی کے بجائے ذکرِ خیر کے مواقع کی تلاش ہوگی، کشفِ عیوب کے بجائے سترِ عیوب ہوگا۔

محبت کے رنگ میں رنگ کر ہی ہم تسخیرِ عالم کا خواب دیکھ سکتے ہیں۔ اگر تسخیرِ عالم کا خواب دیکھنے والے خود اپنے ساتھ چلنے والوں کے دل نہ مسخر کر سکیں، تو خالقِ عالم، سارے عالم کو ان کے لیے کیسے مسخر کر دے گا۔ محبت پیدا ہو جائے تو چھوٹا سا گروہ بھی بڑے بڑے گروہوں کے لیے مقناطیس بن سکتا ہے۔ مقناطیس کی قوت کا ثبوت نہ اس کے دعوے ہیں، نہ کوئی اور ایسی چیز جسے دیکھا، سُنا، سُونگھا یا چکھا جا سکتا ہو۔ اس کی قوت کا ثبوت تو لوہے کے وہ لاتعداد ذرّے ہیں جو خود بخود کھنچ کر اس کے ساتھ چپک جاتے ہیں، اور چپکے رہتے ہیں۔

جماعت کی قوت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم باہمی جھگڑوں، کشمکش اور تنازعات سے زیادہ سے زیادہ پاک رہیں۔ اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ ۖ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۔ (الانفال ۸-۴۶)

(اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

کئی قسم کے تنازعات ہیں جو جماعتی زندگی میں پیدا ہوتے ہیں، جن سے جماعت کمزور ہوتی جاتی ہے، اور اس کی ہوا اُکھڑتی جاتی ہے۔ ان تنازعات پر بھی صبر کے بغیر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ ایک قسم کے تنازعات تو وہ ہیں جو جماعت سے وابستہ افراد کے درمیان نجی نوعیت کے باہمی معاملات اور برتاؤ کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر

تنازعات تو مالی معاملات میں ہوتے ہیں، لیکن گھریلو زندگی، گفتگو اور برتاؤ سے بھی یہ تنازعات پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے تنازعات وہ ہیں جو افراد کے درمیان جماعتی زندگی اور معاملات کے حوالے سے پیدا ہوتے ہیں۔ تیسری قسم کے تنازعات وہ ہیں جو اصحاب امر اور وابستگان جماعت کے درمیان رونما ہوتے ہیں۔

انسان کی فطرت اور اس کے امتحان میں ڈالے جانے کی وجہ سے اس سے مفر نہیں ہے۔ کہ جہاں وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ رہے وہاں تنازعات رونما ہوں۔ کوئی بھی انسانی معاشرہ، خواہ وہ اخلاقی طور پر کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، اس علت سے پاک نہیں ہو سکتا اور نہ ہوا ہے۔ اس لیے تنازعات کے فی نفسہٖ پیدا ہونے سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اتنی تعداد میں نہ ہوں کہ جماعت اور وابستگانِ جماعت کی توجہات، اوقات اور وسائل کا معتدبہ حصہ ان تنازعات میں اُلجھنے اور ان کو حل کرنے کی کوشش میں لگتا رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان تنازعات سے جماعت کی قوت میں اتنی کمی نہ آنے لگے کہ وہ اپنے مقصد کی طرف پیش رفت جاری نہ رکھ سکے۔ تیسری بات یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تنازعات جلد از جلد حل ہو جائیں۔

تنازعات کا ایک بڑا سبب توقعات کا قائم کرنا اور پھر ان توقعات کا ٹوٹنا ہے۔ ساری انسانی زندگی میں تنازعات کا ایک بڑا سبب یہی ہوتا ہے۔ کاروبار ہوتا ہے تو ایک فریق نفع کی ایسی اُمید دلاتا ہے جو پوری نہیں ہوتی۔ یا دوسرا فریق جتنے نفع کی اُمید قائم کرتا ہے وہ بھی پوری نہیں ہوتی۔ توجہ اور برتاؤ و گفتگو سے شکایات کا بڑا سبب بھی شکستہ امید ہی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر شدت کے ساتھ عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔

وَاَجْمِعِ الْیَاسَ مِمَّا فِیْ اَیْدِی النَّاسِ

(مشکوٰۃ شریف کتاب الرقاق)

فنا ہونے والی مخلوق سے ان چیزوں کی توقع جو خود بھی فنا ہونے والی ہیں وہ کیوں رکھے جس کا مقصود و مطلوب وہ ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے!

مالی و کاروباری معاملات میں تنازعات کا سبب اگر کسی ایک فریق کی بد دیانتی ہے تو اس کا علاج سوائے اصلاحِ احوال اور توبہ و استغفار کے اور کچھ نہیں۔ لیکن بالعموم ان تنازعات کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ باہمی شرائط واضح طور پر طے نہیں کی جاتیں، ان کو باہمی اعتماد کی وجہ سے لکھا نہیں جاتا۔ (جو اعتماد ذرا سا بال پڑنے سے بھی ٹوٹ جاتا ہے) کئی چیزیں ہر فریق ازخود اپنے ذہن میں فرض کر لیتا ہے۔ غیر واضح اور مبہم شرائط اور مفروضات کی بنیاد پر قائم ہونے والے معاملے کی کشتی بہت جلد باہمی تنازعات کے بھنور میں پھنس جاتی ہے، اور اس کا تختہ تختہ الگ ہونے کی نوبت آجاتی ہے۔ حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ ہر معاملہ لکھ لیا جائے۔ اور اس تحریر پر گواہ بھی ہوں۔ شرائط واضح اور مکمل ہوں، اور ان کی نوعیت ایسی ہو کہ تنازعات پیدا ہونے کا امکان نہ ہو۔ اگر ہم معاملات میں ہمیشہ ان احکام کی پابندی کریں تو بہت سے تنازعات پیدا نہ ہوں گے۔ یا اگر پیدا ہوں گے تو آسانی سے سلجھنے کے امکانات ہوں گے۔

اس ضمن میں ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات بھی سامنے رکھنے چاہئیں جن میں فی نفسہٖ جھگڑے پیدا کرنے، اور جھگڑوں پر اصرار کرنے پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے، اور خود کو برحق جاننے کے باوجود جھگڑا ختم کرنے کے لیے اپنے حق سے دست بردار ہو جانے پر جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجات کی بشارت دی ہے۔

جماعتی زندگی کے معاملات میں تنازعات کی صورت میں بھی چند اُصولوں کی پابندی سے تنازعات کم بھی ہو سکتے ہیں، اور جو ہوں وہ جلدی سلجھ بھی سکتے ہیں۔ اوّل تو اپنے نفس کے لیے کوئی تنازعہ نہ اٹھانا چاہیے، نہ اس کی پیروی کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہمارا سارا کام تو رضائے الٰہی کی خاطر ہے۔ دوسرے یہ کہ جس سے تنازعہ ہو، سب سے پہلے اس سے ہی گفتگو کرنا چاہیے، اس سے پہلے کہ ہم کسی نجی گفتگو میں، یا کسی مجلس میں، اس کی شکایت کریں یا اپنا کیس فوٹو کاپی کر کے ہر کس و ناکس تک پہنچا دیں۔ دوسرے مرحلہ پر آپ اس معاملہ کو صرف اس شخص کے سامنے پیش کریں، جو اس میں اصلاح کرنے کے لیے ذمہ دار و مختار ہو۔ جن لوگوں کو اصلاحِ احوال کی کوئی ذمہ داری نہ ہو، یا جنہیں

اس معاملہ میں کوئی اختیار نہ ہو، اُن کے سامنے گلہ وشکایت کرنا غیبت کی تعریف میں آجائے گا۔ اگر تحقیق اور اصلاحِ احوال کے لیے ذمہ دار افراد کے سامنے بات رکھنے سے بھی تنازعہ حل نہ ہو، تو پھر تیسرے مرحلہ میں ایسے اجتماعی فورم میں بات رکھیں جو اس کو حل کرنے کے لیے ذمہ دار اور مجاز ہو۔ اگر اسی ترتیب سے تنازعہ حل کرنے کی کوشش کی جائے، اور کسی مرحلہ میں بھی کسی غیر متعلق فرد کو اس میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کی جائے تو بہت سے تنازعات حل ہو جائیں گے۔ اور جو حل نہ ہوں گے ان کا فساد اپنے دائرہ سے باہر نہیں پھیلے گا۔ اس ترتیب وار کوشش سے بھی اگر کوئی تنازعہ حل نہ ہو تو پھر سب سے بہتر راہ صبر کی راہ میں ہر قدم پہ ہی صبر درکار ہے۔ لیکن اس صورت میں تو عزم و محبت کا بہر کردار اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا محبوب ہے۔ اسی لیے اس نے لَا تَنَازَعُوْا (جھگڑا نہ کرو) کے متصل ہی "وَاصْبِرُوْا" کی ہدایت فرمائی۔

مختلف سطح پر جماعت کو چلانے کے لیے ذمہ دار رفقاء اگر صبر و سکون اور ہمدردی سے اپنے رفقاء کی بات سننے کا ظرف اور حوصلہ پیدا کریں اور اپنے برتاؤ کو انصاف، نرمی اور عفو و درگذر پر قائم کریں تو ان کے اور ان کے ساتھ چلنے والے رفقاء کے مابین تنازعات بھی کم سے کم ہوں گے۔

جماعت کی قوت کے لیے ذمہ داروں میں کیا اوصاف ہونے چاہئیں، اور ذمہ داران اور ان کے ساتھیوں کے درمیان تعلقات کن بنیادوں پر قائم ہونا چاہئیں، ان سے باخبر ہونا، اور ان پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے۔ ہمارے لٹریچر میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہوا موجود ہے اس سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔